

## اسباب عروج و زوالِ اہمت

ذیل میں وہ تقریر درج کی جاتی ہے جو خاکسار ڈیڑھ برس برہان نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۲ء کی شام کو انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے زیرِ اہتمام اسلامی ہفتہ کی تقریب پر یونیورسٹی کے یونین ہال میں بصدرتِ ڈاکٹر محمود احمد صاحب ایم۔ اے پی ایچ ڈی استاذِ فلسفہ کی تھی۔ یہ تقریر پونے دو گھنٹہ تک زبانی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کو قلمبند کر دیا گیا ہے۔ جلسہ میں یونیورسٹی کے اساتذہ، طلباء اور محترمہ خواتین کا بہت اچھا اجتماع تھا۔ سب نے اس تقریر کو جس خاموشی اور توجہ سے سنا اس کے لئے ناچیز مقرر سراپا لشکرِ واثقان ہے۔

حضراتِ تاریخِ عالم کا یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں نے نہایت خیر العقول طریقہ پرترنی کی اور اپنے کارناموں کا نقشِ صفحہٴ تاریخ پر اس طرح ثبت کیا کہ دنیا کی دوسری قویوں ان کی عظمت و برتری کے سامنے سراسر اطاعت ختم کر دینے پر مجبور ہو گئیں۔ اب وہی مسلمان ہیں جن پر فلذکات و ادا برسلط ہے۔ ان کا شیرازہ لڑائی پر لگندہ ہے۔ اب ان کی محفلوں میں علم و فن کے مذاکرے بہت کم ہوتے ہیں۔ دماغِ قوت ابداع و اختراع سے محروم اور ہاتھ ہاسی طاقت و قوت کی عنان سے نا آشنا محض ہیں۔ مردم شماری کے لحاظ سے اتنے مسلمان پہلے کبھی نہیں تھے جتنے کہ اب ہیں مگر ساتھ ہی علم و عمل۔ ایمان و ایقان اور روحانیتِ اطلاق کے لحاظ سے جتنے پست اور زربوں حال اب ہیں اتنے کبھی نہیں تھے۔ تاریخِ اسلام کا ایک بتدی بھی جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند سالوں بعد ہی مسلمانوں نے جزیرۃ العرب سے نکل کر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلا نا شروع کیا تو سخت ترین عداوتوں اور حوصلہ فرما مقاموتوں کے باوجود اس انداز سے آگے بڑھتے

رہے کہ نواتیہ کے دور حکومت کے اختتام سے پہلے پہلے جس کی مدت پورے اکیسویں برس بھی نہیں ہے انہوں نے مشرق میں سندھ اور چینی سرکستان تک اور مغرب میں آندلس تک اپنی حکومت و مملکت کے حدود وسیع کر لئے اور ان ملکوں میں صرف سیاسی طاقت و قوت ہی حاصل نہیں کی، بلکہ اسلام کی حقانی تعلیمات، اور اسلامی تمدن و تہذیب کی ناقابل رد دلکشی نے اپنا ایسا رنگ بنایا کہ چند ملکوں کو چھوڑ کر تمام مفتوحہ ممالک خالص اسلامی ملک بن گئے۔ پھر علوم و فنون میں، ایجادات و اختراعات میں، تہذیب نفس اور نظام اخلاق کی ترتیب و تدوین میں انہوں نے اپنی ذہنی و دماغی عظمت و برتری اور ا فوق العادۃ علمی جدوجہد کا ایسا عمدہ ثبوت دیا کہ بڑے سے بڑا معاند مورخ بھی ان کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ لیکن اب حالت بالکل دگرگوں ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان پر ادوار و انحطاط کا تسلط ہے اور علم و عمل کے ہر میدان میں وہ سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ کہیں جہالت نادانی کا دور دورہ ہے۔ اور کسی جگہ دوسری اقوام عالم کی تقلید کا سودا ہے۔ اسلامی انفرادیت بہر حال اس قدر مضاعف ہو چکی ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی پہلے زمانہ کے مسلمانوں کا جانشین یا ان کے منصب غفلت کا وارث کہنا اپنی منہی خود آپ اڑانے کے مترادف ہے۔

اس انقلابِ عظیم کو دیکھ کر فلسفہ تاریخ کے طالب علم کو قدرتی طور پر ان اسباب کا کھوج لگانے کی جستجو ہوتی ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کی ماسیت یکسر منقلب ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن ان اسباب کو بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے اجمالاً ان بنیادی عوامل و دواعی کو معلوم کر لیا جائے جو مسلمانوں کی عظیم الشان ترقی کا باعث بنے اور جنہوں نے کجا ہو کر ان کو دنیا کی سب سے بڑی اور صلح ترین قوم بنایا۔ ان عوامل و دواعی کو معلوم کرنے کے بعد آپ تاریخی اعتبار سے دیکھیں گے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف اندرونی اور بیرونی اثرات کے ماتحت ان عوامل میں کس طرح اضمحلال پیدا ہوتا رہا۔ اور آخر کار کئی صدیاں گزرنے کے بعد جب یہ تدریجی اضمحلال اپنے آخری نقطہ تک پہنچ گیا تو اس کا نتیجہ بدوہ ہوا جو آج ہم سب کے سامنے ہے اور جس کا درد انگیز نظارہ ہر حساس مسلمان کی آنکھ کو ایک پیہم دعوتِ خونابہ فثانی۔ اور ہر درد مند دل کو مسلسل اذن

نفاں سنجی و قائم سرائی دے رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مختصر صحبت میں ایک ہزار برس سے زیادہ کی روئے مذم فاضل کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے میں اصولی طور پر صرف چند اہم امور کی طرف اشارہ کروں گا۔

حکمت | اربابِ علم جانتے ہیں کہ انسان میں دو قوتیں ہیں۔ ایک سوچنے اور غور کرنے کی قوت۔ جس کو قوتِ نظری کہتے ہیں۔ یہ قوت اشیاءِ عالم کی حقیقتیں دریافت کرتی۔ اور ان کی کنبہ و ماہیت کا کھوج لگاتی ہے۔ پھر مختلف اعمال و افعال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتی ہے کہ کوئی سائل اچھا ہے اور اس لئے لائقِ اخذ ہے اور کوئی سائل برا ہے اور اس بنا پر قابلِ ترک ہے۔ قوتِ نظری کے اس فیصلہ کے بعد دوسری قوت یعنی قوتِ عملیہ کو تحریک ہوتی ہے اور وہ قوتِ نظری کے فیصلہ کے مطابق کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی تحریک کرتی ہے۔ ان دونوں قوتوں کا تعلق انسان کے نفس سے ہے۔ ایک مبداءِ ادراک ہے۔ اور دوسری مبداءِ تحریک۔ پھر ان دونوں قوتوں کے ماتحت مختلف قوتیں ہیں جو اپنے اپنے دائرہِ اثر و عمل میں کام کرتی ہیں۔ تمام فلسفہٴ اخلاق کی بنیاد انھیں دونوں قوتوں کے محرکات و ہجیات اور ان کے مقتضیاتِ منطابق سے بحث کرنے پر قائم ہے۔ انھیں دونوں قوتوں کی بے اعتدالی سے جب یہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتی ہیں رذائلِ اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور جب ان میں اعتدال پایا جاتا ہے تو ان سے فضائلِ اخلاق کا ظہور ہوتا ہے۔ فلسفہٴ اخلاق کی اصطلاح میں جس چیز کو حکمت کہتے ہیں وہ انھیں دونوں قوتوں کا انکمال کا نام ہے۔ اور یہی حکمت ہے جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی اساس و بنیاد ہے۔ اس بنا پر زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی بہر حال اس کی کامیابی اور ترقی کا دار و مدار اس ایک بات پر ہے کہ شخصی انفرادی یا قومی و اجتماعی قوتِ نظری اور قوتِ عملی دونوں تندرست ہوں۔ افراط و تفریط سے الگ ہوں اور اعتدال پر قائم رہ کر کسی چیز کو حسن یا قبح سمجھنے یا کسی فعل کے کرنے نہ کرنے کے بارے میں وہی رویہ اختیار کریں جو صحیح معنیٰ ایک میں تندرست اور معتدل قوت کو اختیار کرنا چاہئے جس طرح ہر انسان کی الگ الگ قوتِ نظری اور قوتِ عملی ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس اعتبار سے

پوری قوم کی ایک قوت نظری ہوتی ہے جس کے آئینہ میں وہ اشیاءِ عالم کے حسن و قبح کو دیکھتی اور جانچتی ہے اور پھر اسی طرح ایک ہی اس پوری قوم کی قوتِ عملی ہوتی ہے جس کے باعث قوم کے تمام افراد متحد و متفق ہو کر کوئی کام کرتے ہیں۔ اس وقت ان افراد کے عقائد و اعمال میں ایک ہم آہنگی، یکسانیت اور استواری پائی جاتی ہے۔ ان سب کام کرنا بظاہر ایک ہی مقصد اور ایک ہی جذبہ کے ماتحت ان کی تمام حرکات ہوتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر اس قوم کے مزاج میں فتور نہیں آیا ہے اور اس کا دماغ اور اس کے اعضاء و جوارح تندرست ہیں تو اس قوم کا ہر اقدام مستحسن اور اس کا ہر عمل نیک ہو گا اور یہ قوم دنیا کے تمام انسانوں کیلئے رحمت و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ وہ جس کی سمت کا رخ کرے گی باطل اور شر و فساد کی تمام ظلمتیں خود بخود جھٹتی چلی جائیں گی۔ اور حق و صداقت کے آفتاب کی شعاعیں لمحہ بلمحہ وسعت پذیر ہوتی رہیں گی۔

اس مختصر ترین تہیہ کے بعد اب اسلام کی تعلیمات پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ تمام اسلامی تعلیمات اصلی اور اساسی طور پر صرف دو چیزوں سے متعلق ہیں ایک انسانی عقیدہ اور دوسری انسانی عمل و کردار و عقیدہ کا تعلق قوتِ نظری سے ہے اور عمل و کردار کا تعلق قوتِ عملیہ سے۔ بالفاظِ صحیح تریوں سمجھے کہ اسلام نے ان دونوں قوتوں کے حدود و عمل اور ان کے فرائض و واجبات کی تعیین کر کے انسان کے ہاتھ میں ایک ایسا دستور محکم دیدیا ہے جس کی روشنی میں بالکل صاف طریقہ پر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ قوتِ نظری کو کس چیز کے متعلق حسن ہونے اور کس شے کی نسبت قبیح ہونے کا حکم لگانا چاہئے۔ اور اسی نسبت سے قوتِ عملی کو مرغوبات و مکروہات کی دنیا میں کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا چاہئے، اسلام کا دستور اساسی یعنی قرآن مجید اول سے آخر تک انھیں امور کی تشریح و توضیح اور انھیں حدود و حدود کے بیان و تفسیر پر مشتمل ہے اور اس بنا پر یہ کہنا قطعاً سببِبالغہ ہے کہ اسلام کا منشا انسان کی قوتِ نظری اور قوتِ عملی کو کامل و مکمل کر کے اسے حکمتِ بالغہ کا درس دینا اور اس طرح اُس کو حقیقی طور پر شرف المخلوقات بنانا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو مومنین کے حق میں اپنا ایک بہت بڑا احسان جتانے ہوؤ ارشاد فرماتا ہوں

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ  
بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ لِيُؤْمِنُوا  
عَلَيْهِمْ مَا يَتَّبِعُونَ لَكُمْ مِمَّا رِوَيْكُمْ عَنْ رَسُولِهِمْ  
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَظَنَّ كَانُوا مِنْ  
قَبْلِ لَفَى ضَلَالٍ مُبِينٍ •

بیشک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب اس نے انہیں کے درمیان میں سے ایک رسول بھیجا وہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے۔ ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ یہ پہلے کھلی ہوئی لٹی ضلالت میں تھے۔

یہی وہ حکمت ہے جس کو قرآن مجید کی آیت "وَمِنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" میں خیر

کثیر فرمایا گیا ہے۔ حکمت کو خیر کثیر فرمانے کی وجہ سے ہی علماء اخلاق نے کہل ہے کہ حکمت صرف علم کا نام نہیں بلکہ عمل بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ کیونکہ جو علم بغیر عمل کے ہو اس کا خیر کثیر ہونا تو کجا وہ تو سر اسر وبال اور مصیبت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے "جو علم بغیر عمل کے ہو وہ وبال ہے اور جو عمل بغیر علم کے ہو وہ ضلال ہے" غرض یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا دستور العمل اور نظام نامہ اخلاق و عقائد ہے کہ اگر قوت نظری اور قوت عملی دونوں کی حرکت اس دستور کی روشنی میں ہوگی تو ان قوتوں کے مالک میں حکمت پیدا ہو جائیگی۔ جس طرح کوئی شخص واحد اپنے تمام عقائد و اعمال کی بنیاد اس پر رکھیں گا تو اس کی زندگی بہم وجہ کامیاب ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح جو قوم اس قرآن کو عقیدہ اور عمل دونوں میں اپنا اسوہ بنائیگی وہ بے شبہ دنیا کی سب سے زیادہ صالح اور کامیاب ترین قوم ہوگی۔ اور اسے حق ہو گا کہ سب سے بلند اور رفیع ہو کر رہے۔ آپ یہ خیال کریں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ دعویٰ محض کسی خوش اعتقاد دیہاتی سے ہے۔ اب میں اس کے دلائل بیان کرتا ہوں۔

حکمت کے تمام اقسام کو بیان کرنا اور پھر اسلامی عقائد و اعمال کی ان پر تطبیق کرنا ایک طویل فرصت کا طالب ہے۔ اسلئے میں یہاں مختصر اسلامی عقائد و اعمال میں سے بعض بنیادی امور کا ذکر کرتا ہوں

جن کو مسلمانوں کے عروج و ترقی میں نمایاں دخل ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے انسانی قوت نظری اور قوت عملی کو کامل بنانے کے سلسلہ میں کس خاص نقطہ نظر کو عملی رکھا ہے اور مسلمانوں کے قومی کیرکٹر پر ان کا کیا اثر ہوا ہے۔

توحید | توحید کا تعلق قوت نظری سے ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلامی عقائد کی اساس و بنیاد اسی عقیدہ پر قائم ہے اس عقیدہ کا مفاد یہ ہے کہ انسان ذات و صفات میں کسی کو خدا کا شریک نہ بنائے وہ دل سے اس بات کا یقین رکھے کہ دنیا کے تمام نفع و ضرر کا مالک صرف خدا ہے۔ وہ ہمارا خالق ہے اور ہم اس کے مخلوق۔ ہم سب صرف اسی کی اطاعت اور عبادت کریں گے کسی اور چیز کے سامنے اپنی پیشانی نہیں جھکائیں گے۔

ہمارا رزق، موت، زندگی، عزت و ذلت، کامرانی و ناکامی، دولت و غربت، ان سب کا ملنا ملنا محض خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خواہ اپنے زمانہ کا کتنا ہی بڑا بادشاہ ہو ان چیزوں میں سے کسی چیز کا ذرا بھی مالک و مختار نہیں ہے اس بنا پر ہمیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہئے۔ اسی سے اپنی امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں اور جو کچھ مانگنا ہو اسی سے اس کو طلب کرنا چاہئے۔ اس یقین و اذعان کے ساتھ دل سے اس بات کا بھی اقرار کرنا چاہئے کہ انسان انسان سب برابر ہیں کوئی کسی کا حاکم اور کوئی کسی کا محکوم نہیں کسی شخص کو کسی دوسرے پر آمرانہ چیرہ دستی حاصل نہیں ہو سکتی کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے قانون کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی قانون بنا کر اس کو بندگان خدا پر لازم کر دے البتہ نظام زندگی کو چلانے کیلئے صلاحیت و استعداد کے مطابق تقسیم عمل کی ضرورت ہوگی۔ اس بنا پر کوئی امیر ہوگا اور کوئی وزیر کوئی قاضی اور مفتی ہوگا۔ اور کوئی صناع و تاجر لیکن ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی ذاتی فضیلت و برتری حاصل نہیں ہوگی۔ مرتبہ انسانیت میں یہ سب برابر ہیں۔ ان سب کی مثال ایک بڑے انجن کے پیرزوں کی سی ہے کہ یہ تمام پیرزے اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں تو انجن چلتا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کی ٹرین کو کھینچ کر لے جاتا ہے۔ پس تمام بھلائیاں اور حقیقی فلاح و بہبود انھیں خوش نصیب

انسانوں کے لئے ہے جو اپنی ہستی کو خدا کے وجودِ ابدی و سرمدی میں فنا کر کے اپنی کوئی ذاتی خواہش اور جذبہ رکھتے ہی نہیں۔ ان کی محبت، عداوت، فقیری و درویشی، امارت و ثروت و اہلِ عالم سے مختلف باہمی تعلقات اور ان کی رعایت یہ سب صرف خدا کے لئے اور اسی کے حکم کے ماتحت اور اسی کا فرضِ بندگی بجالانے کے لئے ہوتے ہیں۔ اور یہ انجن کے پرزوں کی طرح اپنے ذاتی نفع و ضرر سے بے خبر ہو کر محض خدا کی رضا جوئی کو لئے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ اللہ کے قانون سے سرکش و باغی ہیں اور دنیا میں شر و فساد پھیلاتے ہیں ان کی مثال اس تپھر کی سی ہے جو گاڑی کو روکنے کے لئے ریلوے لائن پر ڈال دیا گیا ہو ظاہر ہے اگر تپھر چھوٹا سا ہی ہے تو اس کو انجن کی تیز رفتار سی خود بخود راستہ سے دو کر دیگی اور لائن صاف ہو جائیگی۔ اور اگر تپھر کی کوئی چٹان حائل ہوگئی ہے تو اس کو دور کرنے کے لئے زیادہ کم و کوشش کرنی پڑیگی بہر حال یہ سمجھ لینا چاہئے کہ زندگی کی شاہراہ پر حیاتِ اجتماعی کا انجن چلانے کے لئے جس طرح ضرورت ہے کہ انجن کے تمام پرزے ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ کام کرتے رہیں۔ اسی طرح ضروری ہے کہ لائن کو صاف رکھا جائے اور اس پر اگر کوئی تپھر وغیرہ گر پڑے تو اسے دور کر دیا جائے۔

عقیدہٴ توحید کی اس مختصر تشریح کے بعد آپ خود معلوم کر سکتے ہیں کہ جو قوم اس عقیدہ کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں رکھے۔ اور صرف زبان سے اس کا اظہار نہ کرے بلکہ اس عقیدہ کی ایسی ادعائی اور یقینی کیفیت اس کے دلوں میں مقرر ہو کہ لاکھ منطقی دلائل کے باوصف اس میں ذرہ برابر تذبذب پیدا نہ ہو سکے وہ کسی عبادت کی محکوم ہو کر کس طرح زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اسی عقیدہ کا اثر تھا کہ دورِ اول کے مسلمان اپنے وجود کی انفرادیت کو یک قلم بھلا کر اپنے آپ کو خدا کے وجود کا ایک پرتو سمجھتے تھے اور گویا اُن کے برزخِ منہ سے یہ صدا آتی تھی۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا  
اس یقین کے باعث اُن کی نگاہ بلند تھی جو صلےِ عالی اور سمتیں ناقابلِ شکست و زوال تھیں

ان کا ایمان تھا کہ ہمارا مرنا جینا، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا سب خدا کے لئے ہے۔ ہمارا مقصد زندگی خدا کے احکام کی بجا آوری اور اس کے اوامر و نواہی کی دنیا میں تبلیغ و اشاعت ہے اور بس۔ اس کے علاوہ زندگی کا کوئی اور صرف ہی نہیں ہے۔ اس قوی تصور اور ایمان محکم کی وجہ سے ایک طرف وہ دنیا کی بڑی سے بڑی ٹھنڈائی اور دیوی جاہ و خشم سے ذرہ برابر مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ اور دوسری جانب چونکہ ان کے عزائم مستحکم اور ایک مرکز لاہوتی سے وابستہ ہو جانے کی بنا پر ان کے ارادے پہاڑ کی طرح مضبوط اور ازل سے ملے ان کے واسطے کوئی ملے نہیں تھا۔ فلسفہ خودی کا یہی وہ راز ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ تھا اور جس نے مختلف ملکات اخلاق کی شکل میں ظاہر ہو کر ان سے حیرت انگیز کارنامے ظہور پذیر کرائے۔ جو لوگ قوت ارادی کی عجوبہ زائوں سے واقف ہیں انھیں اس بات کے باور کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہئے کہ ایک قوم عالم کے مبداء فیاض سے اپنا رشتہ استوار کر کے دنیا میں کیسے کیسے عجیب غریب کارنامے کر سکتی ہے۔

انقاء | یہاں تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام نے عقیدہ توحید کی تلقین و تعلیم دے کر انسان کی قوت نظری کو کس درجہ معتدل، صالح اور درست بنا دیا اور کس طرح اس کو اشارے حسن و قبح معلوم کرنے کا ایک معیار بتا دیا ہے کہ جو چیز بھی اس معیار پر پرکھی جائے گی اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اب اجمالاً بعض ان اعمال کا ذکر کرنا بھی نامناسب نہ ہو گا جو اسلام نے قوت علی کی تہذیب و تربیت کے لئے منصوص کئے ہیں۔

توحید کا قائل ہو جانے کے بعد بطعابہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن سے خدا خوش ہوتا ہے اور جن کو کرنے سے اس کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ اعمال کیا ہیں جو اس کے قہر و غضب کا موجب بنتے ہیں۔ عقائد کے علاوہ اسلام کی تمام تعلیمات انھیں اعمال کے بیان اور ان کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہیں۔ ان تمام اسلامی اعمال و افعال میں افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ بالفاظ مختصر تر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تمام اسلامی اعمال کی بنیاد اتقار پر قائم ہے یعنی وہ معاملات

جن کا تعلق اللہ اور بندہ کے تعلق سے ہے اور وہ معاملات جو ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے معاملات میں بنیادی طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ تمام انسانی اعمال و افعال کا مقصد حکم خداوندی کی بجا آوری ہے۔ یہاں تک کہ اگر باپ بیٹے پر خبیث کرتا ہے، یا بیٹا باپ کی تعظیم و تکریم کرتا ہے تو اس کی نیت یہ ہونی چاہئے کہ چونکہ خدا نے اس تعلق اَبَوْت و بُتوت کی بنا پر محکوم حکم دیا ہے اس لئے میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اگرچہ اس فعل سے حظ نفس بھی ضرور حاصل ہوگا۔ لیکن ذاتی حظ نفس کا حصول مقصدِ کار نہ ہونا چاہئے۔ اس ایک مثال پر ہی دوسرے شخصی اور بین الاقوامی تعلقات کو قیاس کر لیجئے۔ غرض یہ ہے کہ اسلامی اعمال میں روحِ انقار کے کارفرما ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی قابلِ اُفرا کو قبائلی عصبیت اور دوسرے اولیٰ و تحصباتِ جاہلیت مثلاً وطنیت۔ رنگ و نسل کی برتری۔ دولت و ثروت کا غرورِ جسمانی طاقت و قوت کا گھمنڈ۔ خود غرضی۔ نفس پرستی اور تن پروری، باہمی تباغض و تحاسد، خواہ شخصی ہو یا اجتماعی، ان میں سے ہر ایک لعنت سے نجات مل جاتی ہے۔ اور ان لعنتوں میں گرفتار ہو کر انسانیت کو جس درو کر بے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انسانی سوسائٹیاں ان سے محفوظ ہو کر امن و عافیت کی زندگی بسر کرتی ہیں۔

اسلامی اوامر و نواہی کا مطالعہ آپ علم النفس کی روشنی میں کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے قوائےِ علم میں سے کسی قوت کو نہ تو بالکل جامد و خاند کرنا چاہا ہے اور نہ اس کو بالکل مطلق العنان چھوڑا ہے کہ جو چاہے کرے بلکہ بشری تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ہر ایک قوت کے حدود و عل کی تعین و تحدید کر دی ہے، مثلاً قوتِ شہوی کا کام ہے جلبِ ملائم۔ اور قوتِ غضبی کا دفعِ مضار۔ تو اسلام نے یہ بتایا کہ درحقیقت ملائم یا مرغوب کو کنی چیز ہے اور کوئی نہیں۔ پھر یہ بتایا کہ اگر یہ چیز ملائم و مرغوب ہے تو اس کے جلب و تحصیل کا کیا طریقہ ہے؟ نیز اس کی بھی تشریح کر دی کہ یہ جلب و تحصیل کتنا ہونا چاہئے؟ اس کی کتنی مقدار نافع ہے اور کتنی مضرا اسی طرح قوتِ غضبی کا کام ہے دفعِ مضار۔ تو اسلام نے اس قوت کی تہذیب کے لئے

بتایا ہے کہ واقعی مضار کوئن کوئی چیزیں ہیں، پھر یہ کہ جو چیزیں مضر یا مہلک ہیں ان کو کس طرح دفع کرنا چاہئے اسلامی تعلیمات کی یہی وہ جامعیت اور موزونیت ہے جس کی وجہ سے ان میں اتنی لچک ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر اور ہر شخص کے لئے لائق عمل ہیں۔

عقیدہ توحید و اتقانِ حضرات! اسلامی عقائد و اعمال کی اس روح کو معلوم کر لینے کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ کا مجموعی اثر میں آجاتی ہے کہ جو سوسائٹی ان پر کاربند اور عمل پیرا ہوگی اسے بے شبہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب شائستہ اور مذہب صالحہ کا مالک ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہی وہ سوسائٹی ہوگی جس کے دلوں میں کسی شخص یا کسی قوم کے خلاف ذاتی نفرت و غدا کے جذبات نہیں ہوں گے۔ یہ جماعت حق کی علمبردار اور باطل کے لئے آہنی دیوار یا ایک تیز تلوار ہوگی۔ اس کی نظر میں امیر و غریب، شاہ و گدا، گورے اور کالے، عربی اور عجمی سب برابر اور یکساں ہوں گے۔ ذاتی خصوصیت اور شخصی بغض و غدا کے باعث اس جماعت کا کسی شخص یا کسی قوم سے کوئی بگاڑ نہ ہوگا۔ ملک گیری، یا ملوکیت پرستی کا اس جماعت کے وہم و گمان میں بھی گزر نہیں ہو سکتا۔ عام ہنگام خدا کی رفاہیت۔ اور ان میں انس و عافیت کی فضا قائم کرنا ان کا اولین مطمح نظر ہوگا۔ دوسری طرف اس جماعت کو خدا پر بھروسہ ہوگا۔ اور اس لئے یہ جس کام کا عزم کرے اٹھسکی اسے مخالفت و مقاومت شدید کے باوجود پورا کر کے ریگی۔ اس جماعت کا امیر و نشان صاحب علم و نشان ایک گدائے گوشہ نشین کی طرح متواضع بن سکے اور فروتن ہوگا۔ اور وہ اپنی دولت و امارت کو عطیہ خداوندی سمجھ کر اسے خلق اللہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیگا۔ اور پھر جوان میں فقیر و مفلس ہوں گے ان کو ہاتھ اگر چہ خالی ہوں گے اور ان کے گھروں میں شاید بوہرے بھی نہ ہوں لیکن ان کی آنکھوں میں استغفار کا نور چمکتا ہوا اور ان کی پیشانیوں سے قناعت و صبر کا اطمینان برتا ہوا نظر آئے گا۔ قلت مال بلکہ فقدان مال کے باوجود دبیدہ سکندری ان کے چہرہ بشرہ سے عیاں۔ اور جاہ و جلال فریدی ان کی صورت و شکل سے آشکارا ہوگا، یہ خدا کے ہوں گے اور خدا ان کا ہوگا۔ جدہر یہ رخ کریں گے اقبال و ظفر مندی

ان کا قدم لے گی۔ ان کو ہتھیاروں اور توپ و تفنگ کی بھی ایسی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہ جس طرف نگاہ اٹھائیں گے قوموں اور جماعتوں کی تقدیروں کو پلٹ کر رکھ دیں گے۔ یہ جس زمین پر اپنے گھوڑے دوڑائیں گے زمین اپنے خزانے اگل کر ان کی کنجیاں ان کے ہاتھوں میں دیدیگی، صرف جنگی میں اور زمین کے اوپر نہیں بلکہ سمندروں کی طوفانی موجوں میں بھی خفی کا علم سرفراز و سر بلند کرنے کیلئے یہ کود پڑیں گے تو یہ متلاطم موجیں بھی ان کے عزائم روک نہ سکیں گی۔ اب آپ عہد صحابہؓ کے حالات کا مطالعہ کیجئے اور بتائیے کہ ان اوصاف کی حامل کیا ان صحابہؓ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور جماعت بھی ہوئی ہے؟ یہ میں نے جو کچھ عرض کیا اس میں ذرہ برابر شاعرانہبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت واقعہ ہے جس کی شہادت تاریخ کے صفحات اب بھی دے رہے ہیں، دنیا میں بڑے بڑے بہادر اور شیر افگن رستم و سہراب پیدا ہوئے۔ مگر بتاؤ کسی قوم میں کوئی بہادر علیؑ جیسا بھی پیدا ہوا جس نے اپنے سخت ترین دشمن جاں کافر کو اس پر قابو پالینے کے بعد محض اس لئے چھوڑ دیا کہ اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا تھا کہ اب اگر وہ اس کو قتل کرتے تو اس میں ذاتی انتقام کا شائبہ بھی پیدا ہوا جاتا تھا، دنیا میں بڑے بڑے عادل، انصاف پسند اور رحمدل بادشاہ گذرے ہیں۔ مگر کوئی قوم عمر جیسا بھی کوئی حکمران پیش کر سکتی ہے جو پونہ لگے ہوئے کپڑے پہنکر اور فرش خاک پر بیٹھ کر عرب و ایران کی قسمتوں کے فیصلہ کرتا تھا اور جسے بیوہ اور غریب عورتوں کے چوٹھوں میں آگ جلانے اور کھانا پکانے میں بھی دلیغ نہیں ہوتا تھا قوم و وطن کے لئے عظیم الشان قربانیاں کرنے والوں کی کمی نہیں۔ لیکن انسانی جدوجہد کی پوری تاریخ بھی خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے کہ فتنہ پردازوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص مکان میں داخل ہو کر آپ کو قتل بھی کر دینا چاہتا ہے۔ مگر صاحبِ خلافت و امارت ہونے کے باوصف آپ ان لوگوں کے مقابلہ میں کسی ایک شخص کو بھی تلوار اٹھانے کی اجازت محض اس لئے نہیں دیتے کہ کہیں فتنہ کے دروازہ کا کھلنا آپ کی ہی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ غور کرو۔ انتہائی شجاعت و دلیری کے ساتھ یہ تواضع و فروتنی اور خدا ترسی۔ سیاسی طاقت و قوت کے باوجود

معمولی درجہ کے انسانوں کے ساتھ بالکل مساویانہ بلکہ خادمانہ برتاؤ۔ شدت و صولت کے ساتھ رحمہری اور رقت، فقری اور غلی کے ساتھ کامل استغناء اور اطمینان نفس۔ کمال دولت و ایالت کے ہوتے ہوئے یتیمیت، اگلیبے نفسی اور بے غرضی۔ قبائلی عصبیت کی مسموم آب و ہوا میں پرورش پانے کے باوجود اسلام قبول کرتے ہی ان میں ایسا انقلاب پیدا ہو جاتا کہ اسلام قبول کر کے جوان کا بھائی بن جاتا ہے اس کے لئے یہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ عہد جاہلیت میں قبائلی رقابت کی بنا پر ان میں کیسی ہی مہر کہ آریاں ہو چکی ہوں اور اس کے برعکس خاص اپنے عزیزوں قریبوں اور چہیتوں کو اللہ کے راستہ میں قتل کرنے پر آمادہ ہو جانا جن کی حمایت و مدافعت اسلام سے پہلے ان کی زندگی کا اولین فریضہ تھا، مختصر یہ کہ مختلف و متضاد اخلاق و ملکات میں یہ توازن و اعتدال کیا سوائے اس جماعت کے کسی اور میں بھی پایا جاسکتا ہے جس کی قوت نظر و عمل کسی غیر معمولی اثر کے ماتحت نہایت محتدل و مہذب ہو چکی ہو۔ اور جس نے تمام افراد تئوں کو یکمل فراموش کر کے اپنے آپ کو ایک وجود اعلیٰ و اشرف کے ساتھ وابستہ کر لیا ہو۔ ایک دو نہیں صحابہ کرام کی سوانح حیات سے ہزاروں مثالیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام اوصاف حمیدہ و اخلاق فاضلہ بیک وقت اسی جماعت میں پائے جاتے تھے جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے منور ہو رہی تھی، ہر دور میں اور ہر جماعت میں بڑی بڑی فوجیوں کے انسان پائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ عرب کے بدوؤں جیسے غیر مہذب و ناشائستہ لوگوں میں سے بیکایک ایک بہت بڑی جماعت ایسی پیدا ہو گئی ہو جس کا ہر فرد ذہنی و عملی محاسن کے آسمان کا آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا ہو۔ اور جس نے فکر و نظر اور عمل و اخلاق کے بہترین نمونے پیش کر کے اپنے انسان اعلیٰ ہونے کا ثبوت بہم پہنچا یا ہو۔

اس مختصر گزارش سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اولین دور میں جو مسلمان جماعت پیدا ہوئی وہ چونکہ فکری اور نظری اعتبار سے عقیدہ توحید پر ایمان صادق و بلاغ رکھتی تھی اور پھر عملی لحاظ سے

اس کے تمام کاموں میں، عبادات و معاملات میں۔ اخلاق اور عادات میں ”اتقا“ کی روح کا فرما تھی۔ اس بنا پر یہ جماعت دنیا کی سب سے زیادہ صالح جماعت تھی اور بقاِ اصلح کے قانونِ فطری کے مطابق اس جماعت کو ہی حق تھا کہ وہ سب پر فائق و برتر ہو کر رہے چنانچہ یہی وجہ تھی کہ احکم الحاکمین کی طرف سے ان کو مژدہ سنا گیا۔  
لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ - تم ہلکتے نہ ہو اور غم نہ کرو۔ تم تو بلند ہو۔

پھر ان کو انہی نے خود اپنی جماعت قرار دیا اور ان کیلئے فلاح کا وعدہ فرمایا گیا۔ ارشاد ہے۔

الان حزب الله هم المفلحون • خبردار ہو کہ بے شبہ اللہ کا گروہ ہی فلاح یاب ہوگا

شاعرِ ملت اقبال نے کہا ہے۔

یقین محکم، عملِ بہیم۔ محبت فاتحِ عالم  
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں  
اس میں شبہ نہیں کہ یقین محکم اور عملِ بہیم یہی دو ہتھیار ہیں جن سے کوئی قوم اپنے دشمنوں پر فتح پا  
ہو سکتی ہے لیکن جیسا کہ میں ابھی بتا چکا ہوں۔ یہ صرف فرزندِ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ یقین  
محکم رکھتے ہیں لیکن کس چیز کا؟ نسلی۔ وطنی۔ یا نسلی اعتبار سے دوسروں پر فائق ہونے کا نہیں بلکہ اس بات کا  
کہ ”خداے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں توڑ“

پھر یہ قوم عملِ بہیم بھی کرتی ہے تو اسی غالب تصور و ایمان کے زیراثر اس بنا پر یہ ظاہر ہے، کہ  
مسلمانوں کا ”یقین محکم“ اور ان کا ”عملِ بہیم“ اپنے اندر ایک ایسی خصوصیتِ فائقہ رکھتا ہے کہ وہ عقیدہ  
توحید اور اعمال میں ”اتقا“ کی رعایت رکھے بغیر کسی میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ تیسری چیز جو اقبال نے بیان کی  
ہے وہ محبت ہے جس کو انھوں نے فاتحِ عالم کہا ہے۔ یقین محکم اور عملِ بہیم کی طرح یہ ”محبت“ مسلمانوں کی  
طرح دوسری اقوام میں پائی جاسکتی ہے۔ مگر مسلمانوں کی محبت بھی ان کے یقین و عمل کی طرح دوسری اقوام  
کی محبت سے کیسے مختلف ہے۔ ان کی محبت کسی ذاتی حظِ نفس۔ یا نفسی خواہش پر مبنی نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کے  
تعلق کے اعتبار سے اس محبت کی بنیاد انسانی اخوت کے احساس اور خلوص و ولہیت کے جذبہ پر قائم ہوتی ہے

اسی محبت کو ”حب فی اللہ“ کہتے ہیں۔ اس محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کسی قوم سے اگر جنگ بھی کرتے ہیں تو چونکہ اس جنگ میں ہوس ملک گیری یا جذبہ ملوکیت پسندی کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ ہنگامہ خانہ خلیفہ کی اصلاح و ہدایت۔ اور خالصتہً لوجہ اللہ اعلیٰ رکھتے ہیں اس کا مقصد ہوتا ہے اس بنا پر یہ عام فاتحین عالم کی طرح مفتوح اقوام کے ساتھ ناگوار جبر و تشدد کا معاملہ نہیں کرتے اور سختی کے ساتھ ان احکام کی پابندی کرتے ہیں جو اس بارہ میں ان کو خدائے بتائے ہیں۔ اس صلح جو بیادہ روش کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فریق مخالف اپنے ہنگامی یا جذباتی بغض و عناد کی عینک اتار کر جب ان کے اخلاق و اعمال اور ان کے مقدس باطنی احساسات و جذبات کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی عداوت محبت سے اور اس کا تناظر اُنیسیت و اُلفت سے بدل جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان صرف کسی ملک کی زمین کو ہی فتح نہیں کرتے بلکہ اپنی للہیت اور انسانی خیر اندیشی و خیر سگالی کے باعث اہل ملک کے دلوں کو بھی سحر کر لیتے ہیں یہی وجہ تھی کہ ایران کی جنگ میں ایرانی فوج کے چار ہزار سپاہی بیک وقت مسلمان ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی صف سے آئے۔ پھر یہ لوگ یونہی دکھاوے کے مسلمان نہیں تھے بلکہ ان کی جوتلواریں مسلمانوں کے مقابلہ میں کام آتی تھیں اب ان کی حمایت و اعانت میں کام آنے لگیں چنانچہ یہ سب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے زیرِ علم مدائن اور جلولار کی جنگ میں شریک ہوئے اور اس معرکہ کو حیت کر سرخروئی حاصل کی۔ فاتحِ سندھ محمد بن قاسم کو کون نہیں جانتا کہ اس نے سندھ میں دشمن کو کس بری طرح پامال کیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے اسلامی اخلاق اور کیرکٹر سے مفتوحین کے دلوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ علامہ بلاذری کے الفاظ یہ ہیں:-

”یزید بن ابی کبشہ اسکی سندھ کا گورنر ہو کر آیا۔ اور اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق روانہ کیا تو اہل ہند زار و قطار روتے تھے اور انھوں نے یادگار کے طور پر محمد بن قاسم کی تصویر بنانے کی کیرج میں رکھی۔“

میں نے محبت کی یہ تشریح ضمناً ذکر کر جانے کی وجہ سے کی ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ عقیدہ توحید اور اتقار“ یہ دو بنیادی امور ہیں جن پر تمام فضائل اخلاق کی بنیاد قلم ہے انھیں فضائل اخلاق میں سے ایک محبت بھی ہے۔ فلسفہ اخلاق میں ”عدالت“ کو جامع فضائل اخلاق کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ عقیدہ توحید اور اتقار ان دونوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان میں عدالت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ نظری اور عملی دونوں قسم کے کمالات و فضائل کا جامع بن جاتا ہے۔ اب اس وقت اس جماعت میں ایسی زبردست طاقت و قوت اور مصائب انگیزی و جفا کشی کی ایسی جرأت و ہمت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسری جماعتیں اس کے سامنے سہرا لگنی پر مجبور ہو جاتی ہیں اور اس جماعت کے غیر معمولی عزم و ارادہ کو دیکھ کر شاہانہ جاہ و جلال کے باوصف ان کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں۔ حضرت نعمان بن مقرن کی سرکردگی میں سفرِ اسلام شہنشاہِ ایران یزدگرد کے دربار میں پہنچے تو اُس وقت ایرانی رسم و رواج کے مطابق دربار اس شان و شوکت سے سجایا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ لیکن یہی سفرِ اسلام جب عربی جے پہنچے۔ کاندھوں پر پٹنی چادریں ڈالے۔ اور ہاتھوں میں کوڑے لئے اور موزے پہنے نہایت بے باکی اور حد درجہ شانِ استغفار کے ساتھ دربار میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں سے ایسی ہیبت ظاہر ہوتی تھی کہ شہنشاہِ ایران مرعوب ہوا جاتا تھا۔ ابو جابر الفارسی کے دادا کا جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے بیان ہے کہ میں خود قادیسیہ کی جنگ میں شریک تھا اور ایرانیوں کی طرف سے مسلمانوں سے لڑ رہا تھا۔ شروع شروع میں عربوں نے ہم پر تیر پھینکے تو ہم نے کہا ”یہ تیر کہاں ہیں، یہ تو تھکے ہیں“ لیکن آخر کار انہی تھکوں نے ہمارا کام تمام کر کے رکھ دیا ہم ادھر سے جوتیر پھینکتے تھے وہ کسی مسلمان کے کپڑوں سے الجھ کر رہ جاتا تھا لیکن مسلمانوں کی طرف سے جو تیر تانا تھا مضبوط سے مضبوط زبرہوں اور ڈبل خودوں کو چیرتا ہوا باہر نکل جاتا تھا۔“

اسی قسم کا ایک اور واقعہ سنئے۔ ایرانیوں کا شکست خوردہ لشکر قادیسیہ سے بھاگ کر مدائن پہنچا

درمیان میں دریائے جہلم پڑتا تھا۔ ایرانیوں نے دریا کو پار کرنے کے بعد تمام کشتیاں دریائے الگ کر لیں اور پلوں کو آگ لگا دی تاکہ مسلمان ان کے ذریعہ دریا کو عبور کر کے ان کا تعاقب نہ کر سکیں۔ لیکن مسلمان مسلمان تھے اصول نے دریا میں گھوڑے ڈال دیے اور دریا کو پار کر گئے۔ اب ایرانیوں نے یہ منظر دیکھا تو آپس میں کہنے لگے، ”قسم خدا کی تم تو انسانوں سے نہیں جنوں سے لڑ رہے ہو۔“

اب بتائیے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ عزم و حوصلہ اخلاقی اور روحانی قوت و انبساط کے بغیر کسی قوم میں پیدا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس ایمان و عمل کا یہی وہ مقام رفیع تھا جس پر صحابہ کرام کی جماعت فائز تھی اور اس بنا پر یہ جماعت دنیا کی سب سے زیادہ شائستہ اور صالح جماعت تھی۔ اور تقابلاً صلح کے فطری قانون کے مطابق اسی کو حق تھا کہ وہ سب پر فائق و بزرگ ہو کر رہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا تا تاریخ کے صفحات ان کے شاندار کارناموں سے پُر ہیں اور اس کی بنیاد وہی ہے جو میں نے بیان کی۔

(باقی آئندہ)

موجودہ زمانہ کی بہترین سیاسی کتاب۔ شہنشاہیت کی حقیقت، اس کی تاریخ و تفصیل اور اس کے نتائج و اثرات پر اردو میں پہلی کتاب جس کی تقریب کے سلسلہ میں مولانا سید طفیل احمد صاحب ”شہنشاہیت“ جدید سیراپیاری کی مکمل تاریخ جدید مسلمانوں کا روشن مستقبل“ لکھتے ہیں۔

”یہ کتاب جدید سیراپیاری کی مکمل تاریخ ہے۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ یورپ کے ملکوں میں سرمایہ داروں کی محدود جماعت نے حکومت پر قبضہ کر کے نوع انسانی کو کس طرح غلام بنایا اور دنیا کے بازاروں پر قابض ہو کر اپنی ذات کیلئے عیش و آرام کے سامان کو کونکر جمع کئے۔ اس کتاب کو اردو میں منتقل کر کے اردو والی پبلک پر بڑا احسان کیا گیا ہے۔“

اس کتاب کے مطالعہ سے موجودہ ہولناک جنگ کے اسباب و وجوہ بھی پورے طور پر سمجھ میں آجائے ہیں صفحات ۱۰۰ قیمت مجلد ۱۰/-

”منبر مکتبہ برہان“ قرول باغ دہلی